مقاصد قرآن

از جناب مولانا صبغۃ اللہ حسینی صاحب استاذ جامعہ دار السلام عمر آباد

(۴)

روزہ: یہ بھی ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے جس کو اس لیے فرض کیا گیا ہے کہ انسان کے ملکی جذبات نشوونما پاکر اپنے ارتقائی منازل پر پہنچ سکیں اور جس قدر بہیمی اور سفلی میلانات ہیں ان کی قوت ٹوٹ جائے تاکہ انسان برائیوں سے محفوظ رہ سکے۔ یہی وہ عبادت ہے جس کے احکام کسی قدر مفصل بیان کیے گئے ہیں اور اس کے فوائد و منافع پر بھی نہایت دلنشین پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے چنانچہ روزہ کی فرضیت اور اس کے فلسفہ کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۔ (سورہ بقرہ۔ رکوع ۲۳)

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے جاتے ہیں جس طرح تم سے پیشتر کے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

"صوم" کے معنی لغت میں مطلق رک جانے کے آتے ہیں اور شریعت نے اس کو ایک خاص معنی کے لیے استعمال کیا ہے یعنی صبح صادق سے آفتاب کے غروب ہو جانے تک کھانے، پینے اور مباشرت سے رکے رہنا۔ قرآن عزیز ہم کو اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ یہ کوئی نئی عبادت نہیں جو نوع انسانی پر ڈالی جا رہی ہے بلکہ پچھلی قوموں اور امتوں پر بھی اس کو لازم قرار دیا گیا تھا۔ خصوصاً عاشورہ کے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو فرعون کے پنجۂ استبداد سے نجات ملی تو یہودیوں نے اس دن روزہ رکھنا شروع کر دیا۔ اسی طرح عیسائیوں میں بھی روزہ رکھنے کا دستور تھا۔ مگر انہوں نے جس طرح

اور اعمال صالحہ کو کفار کے عقیدہ کی بنا پر پس پشت ڈال دیا اسی طرح روزہ سے بے توجہی برتی بہر حال دنیا
کے تمام مذاہب وملل اور اقوام میں یہ عبادت رائج تھی گو اس کی نوعیت میں کسی قدر اختلاف تھا۔

"لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" میں فرضیت صوم کی وجہ اور صوم کی حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ نیز اس کا فلسفہ بتلایا جا رہا ہے کہ اس عبادت کے ذریعہ نہ صرف اشخاص کی روحانی اصلاح ہوتی ہے بلکہ اجتماعی زندگی بھی برائیوں سے پاک اور بھلائیوں سے لبریز ہو جاتی ہے مالداروں کو اس چیز کا اچھی طرح احساس ہو جاتا ہے کہ بھوک اور پیاس میں غریبوں پر کیا گذرتی ہوگی۔ اسی کے باعث شکم سیروں اور فاقہ مستوں کو ایک سطح پر کھڑا کیا گیا ہے جس کے ذریعہ مساوات عمومی کا تخیل عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر یہی وہ عبادت ہے جس کی وجہ سے ملکوتی قویٰ میں تقویت اور بہیمی جذبات میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اور خدا رسی اور خدا ترسی کے احساسات تیز سے تیز تر ہو جاتے ہیں۔ گرمی کا موسم ہے سخت پیاس ہو رہی ہے، تن تنہا روزہ دار بیٹھا ہوا ہے اور مکان میں ٹھنڈا پانی رکھا ہوا ہے مگر وہ نہیں پیتا۔ روزہ دار کو سخت بھوک لگی ہوئی ہے، بھوک کی وجہ سے جسم میں ضعف بھی محسوس ہو رہا ہے کھانا موجود ہے دیکھنے والا بھی کوئی انسان نہیں مگر وہ نہیں کھاتا۔ دل پسند حسین وجمیل بیوی پاس بیٹھی ہوئی ہے، فریفتگی کے جذبات، محبت کی امنگیں دونوں میں موجزن ہیں لیکن ان سب کی طرف روزہ دار کی خواہش نہیں ہوتی اور وہ احتراز کرتا ہے اس لیے کہ اس کے دل میں اس خدا کی عزت اور اس کے حکم کی حرمت بیٹھ چکی ہے جو اس کی ہر ایک کھلی چھپی حالت کو جانتا ہے اور اس خداوند قدوس کا جلال اس کے دل میں سما گیا ہے جس کے آگے کسی کی کوئی قوت نہیں چل سکتی پھر جب انسان اپنے حقیقی پروردگار کے حکم سے جائز، پاکیزہ اور حلال خواہشوں کو چھوڑ دینے کا اپنے آپ کو خوگر بنائے گا تو اسی خدا کے خوف سے حرام، ناجائز اور ناشائستہ حرکتوں کو چھوڑ دینے کی اس میں زیادہ قوت پیدا ہو جائے گی۔ یہی طاقت ہے، جو روزہ دار کے اندر پیدا کر دینا اسلامی شریعت کا مقصد ہے جیسا کہ حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے کہ اگر کوئی روزہ دار جھوٹ بولنا، لغو بکنا اور

بیہودہ کاموں کو نہیں چھوڑتا تو خداوند تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا وغیرہ ترک کرنے کی کوئی پرواہ نہیں۔ اسی طرح ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص روزہ رکھے تو نہ بیہودہ باتیں زبان سے نکالے اور نہ شور وشغب کرے، اور اگر کوئی اس کو گالیاں دے تو کہدے میں روزہ دار ہوں یہ کام میرے لیے سزاوار نہیں۔

غرض اس عبادت کے ذریعہ انسان میں ملکات فاضلہ پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ خلافت الٰہی کی امانت اس کے سپرد کر دی جائے۔ اب اس میں اس اہم کام کے سنبھالنے کی کافی استعداد پیدا ہو چکی ہے۔

حج | حج کے معنی لغت میں ارادہ کرنے کے آتے ہیں اور عمرہ کے معنی زیارت کرنے اور آباد کرنے کے ہیں۔ اسلامی شریعت کی اصطلاح میں "حج و عمرہ" ان خاص مراسم و عبادات کی ادائیگی کے لیے سفر کرنے کو کہتے ہیں جو بیت اللہ الحرام سے مخصوص ہیں اور جن کے باعث کعبہ کی آبادی ہوتی ہے۔

اسلام کی ان چار بنیادوں میں سے جس پر قصر اسلامی کی عمارت کھڑی ہے ایک حج بھی ہے یہی وہ خاص عبادت ہے جو سوائے بیت اللہ الحرام کے اور کسی مقام پر ادا نہیں کی جا سکتی۔ بخلاف نماز، زکوٰۃ اور روزہ کہ ہر مقام پر اپنے اوقات و شروط کے ساتھ ادا ہو سکتے ہیں۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام عبادتیں تو مکانی خصوصیت سے علٰحدہ ہیں اور صرف یہی عبادت کیوں ایک مکان مخصوص کے ساتھ مختص کر دی گئی ہے حالانکہ تمام روئے زمین خدائے تعالیٰ ہی نے بنائی ہے؟ بے شک تمام زمین خدا ہی کی ہے اور امت محمدیؐ کے لیے کل روئے زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے لیکن ہر خطۂ زمین میں وہ خصوصیات نہیں ہیں جو اس بقعہ نور سے تعلق رکھتی ہیں یہی وہ مقام مبارک ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائے تعالیٰ کے حکم سے خانۂ کعبہ کی تعمیر فرمائی اور تمام لوگوں میں اس بات کی منادی کر دی کہ پیادہ یا سواریوں پر ہر طرف سے چلے آئیں۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (الحج-۴)

اور تم لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ لوگ تمہارے پاس پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر سوار بھی چلے آئیں گے جو دور و دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی۔

تمام انبیاء کرام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چند خصوصیات حاصل ہیں۔ اول یہ کہ آپ ہی تمام قوموں کے مسلم الثبوت پیغمبر ہیں۔ اور آپ ہی کو تمام دنیا والوں کے لیے امام بنایا گیا ہے اور یہ "امامت کبریٰ" کا جلیل القدر منصب بھی بہت سی آزمائشوں سے کامیاب گذرنے اور بہت سی قربانیاں دینے کے بعد عطا کیا گیا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم ہی کا وہ خاندان ہے جس میں صدیوں تک نبوت رہی حتیٰ کہ آپ ہی کے خاندان سے خدا کا آخری پیغمبر پیدا ہوا جس کے ہاتھوں دین کی تکمیل ہوئی اور جس اسلام کی حقیقت کو ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا وہ تمام مدارج ارتقا طے کرتا ہوا دور محمدی میں آکر اپنے شباب پر پہنچ گیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی پر غور کرنے سے "توحید" اور "اسلام" کی حقیقتیں پوری طرح آشکارا ہوجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو قرآن عزیز نے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا ہے اُسی طرح حضرت ابراہیم کی عملی زندگی کو بھی امت اسلامیہ کے لیے نمونۂ عمل بنایا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ۔

تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں ایک نمونہ تھا۔

غرض مکۂ مکرمہ کو حضرت ابراہیم کی ذات سے اور حضرت ابراہیم کو "حقائق اسلامی" سے گہرا تعلق ہے جس کی بنا پر اس عبادت کو خانۂ کعبہ ہی کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرما کر مدینۂ طیبہ تشریف لانے کے بعد بھی حج فرض نہیں ہوا بلکہ مکۂ معظمہ کے فتح ہو جانے کے بعد ۸ھ میں حج و عمرہ کا حکم دیا گیا اور سب سے پہلا حج ۹ھ میں حضرت ابوبکر صدیق رض کی قیادت میں کیا گیا۔ پھر اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ

میں اعلان فرمایا کہ میں حج کو جانے والا ہوں تو بے شمار پروانے شمع محمدی کے ارد گرد جمع ہو گئے اور یہی آپ کا پہلا اور آخری حج تھا جس کو حجۃ الوداع" کہتے ہیں جس میں آپ نے نہایت زبردست خطبہ دیا تھا اور اسی وقت تکمیل دین کی بشارت دی گئی تھی۔

بہر حال حج ایک زبردست اسلامی فریضہ ہے جس کے ادا کرنے کے لیے شوال سے ذوالحجہ تک کا زمانہ مقرر کیا ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (سورہ بقر - ۲۵) حج کے چند مہینے مقرر ہیں (شوال، ذی قعدہ، اور ذی الحجہ)

اور حج انہیں لوگوں پر فرض ہے جو استطاعت رکھتے ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ - (سورۂ آل عمران رکوع ۱۰)

اور لوگوں کے ذمہ اللہ کے واسطے بیت اللہ الحرام کا حج کرنا ہے اس شخص پر جو راستے کی طاقت رکھتا ہے (یعنی زاد و راحلہ پر قادر ہو) اور جو منکر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سب عالم والوں سے بے نیاز ہے۔

اس آیۃ کریمہ میں استطاعت کے ہوتے ہوئے حج نہ کرنے کو "کفر" سے تعبیر کیا ہے جو نہایت شدید وعید ہے آج کل عام طور پر یہ خیال ہو گیا ہے کہ حج کو جانے والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ دنیا کے کاموں سے فارغ ہو جائیں۔ خاندانی معاملات طے ہو جائیں۔ خاندان میں ہونے والی شادیاں ہو چکیں۔ غرض جب دنیا میں کوئی کرنے کا کام باقی نہ رہے، تب خدا کے گھر کا رخ کیا جائے۔ حالانکہ اگر دل میں کچھ بھی خدا کی محبت ہو اور حساب و کتاب کا کچھ بھی خیال ہو تو مسلمان کا فرض ہے کہ جس وقت اس میں سفر کی استطاعت پیدا ہو جائے، وہ سب کاموں سے پہلے کعبہ کا رخ کرے۔ حدیث میں ایسے شخص کے لیے سخت وعیدیں آئی ہیں جو استطاعت رکھ کر بھی حج کو نہیں جاتا۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص صحیح سالم ہو اور حج کرنے پر قادر ہو پھر ادا نہ کرے اور مر جائے تو چاہے یہودی ہو کر مر جائے یا

عیسائی ہو کر وہ اسلام کی موت تو نہیں مرتا۔

جس طرح اسلام نے ہر عبادت کے اندر فوائد و اسرار رکھے ہیں اسی طرح حج میں بھی بے شمار فائدے اور انگنت دینی و دنیوی منافع اور مصالح ہیں بلکہ اسلامی عبادتوں میں جس ہیئت اجتماعی کی تشکیل مدنظر ہے اس کی تکمیل یہیں آکر ہوتی ہے۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ وحدتِ اُمت کا تخیل بغیر اس کے جامۂ عمل نہیں پہن سکتا کہ اس امت کے لیے کوئی مرکز مقرر کیا جائے جہاں اطراف عالم کے مسلمان لازمی طور پر جمع ہوں ایک دوسرے کے حال سے واقف ہوں مل کر ایک خدا کی عبادت کریں، ایک مرکز کے گرد گھومیں، اور دل میں شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر یہ نقش تازہ کرکے جائیں کہ ہم ایک خدا کے پرستار ایک قوم ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا قومی اجتماع کسی ایسے مقام پر نہیں ہو سکتا جہاں اگرچہ مادی تمدن کے لوازم اور اس کے طمطراق کی چیزیں تو سب کچھ موجود ہوں مگر کوئی روحانی وقار نہ ہو اسی لیے اس مبارک مقصد کے لیے "وادی غیر ذی ذرع" کو منتخب کیا گیا تاکہ اس اجتماع کا مقام ایک ایسا مقام ہو جس سے اسلام کی بہترین روایات وابستہ ہوں، جس کا ذرّہ ذرّہ خدا کے نام پر مرنے والوں کی زندگی کا شاہد ہو، جہاں آیاتِ الٰہی ہر طرف چھائی ہوئی ہوں اور کفر و شرک کا نام و نشان تک نہ ہو، جہاں امت مسلمہ کو پوری آزادی حاصل ہو اور کوئی خارجی اثر مسلم اور مسلم کے درمیان حائل نہ ہو۔ ایسی فضا میں جب مسلمان جمع ہوں گے تو وہ اپنے دامن نہ صرف روحانی برکتوں سے بھر کر واپس ہوں گے بلکہ ہر قسم کی دنیوی اور مادی منفعتیں بھی ان کو حاصل ہوں گی ایسی کی طرف اشارہ ہے قرآن کی اس آیت میں کہ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ۔

یہی سبب ہے کہ دشمنان اسلام نے "خلافت" کے بعد اگر کسی چیز کو بھانپا ہے تو وہ یہی عبادت حج ہے آئے دن مختلف غیر اسلامی حکومتوں کی طرف سے اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں کہ

کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ غلام مسلمان آزاد مسلمانوں سے وادی بطحا میں ملیں اس لیے کہ جب وہ واپس اپنے اپنے ملک کو لوٹ کر جائیں گے تو ظاہر ہے کہ ان میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوگی، اور وہ کسی غیر اسلامی حکومت کا جوا اپنی گردن میں ڈالے رہنے کو ہرگز پسند نہ کریں گے، اور خود آزاد مسلمان قوموں میں بھی ان کے لیے ہمدردی و اعانت کے جذبات پیدا ہوں گے۔

الحاصل اسلامی عبادات پر غور کرنے سے یہ چیز اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن حکیم کا مقصد محض ایک ایسی نظری تعلیم پیش کرنا نہیں ہے جو کبھی شرمندۂ عمل نہ ہوسکے بلکہ وہ ایسی تعلیمات پیش کرتا ہے جو نظری اور عملی دونوں اعتبار سے نوع انسانی کے لیے کامیابی کا اعلیٰ ذریعہ بن جاتی ہیں بخلاف اس کے اگر آپ عیسائیوں کی تعلیم پر ایک سطحی نگاہ ڈالیں تو یہ امر بالکل واضح ہوجائے گا کہ جو طریقہ مسیحیت نے انسانی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہ خالص خیالی فلسفہ ہے اس کو عملی دنیا سے کوئی علاقہ نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ انسانی فطرت کے مقتضیات کے مناسب نہیں ہے۔

مثال کے طور پر مسیحیت دنیا کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ دشمنوں سے بھی دوستی اور محبت کرنی چاہیے اور جو شخص برائی سے پیش آئے اس کے ساتھ بھی نیک سلوک کرنا چاہیے۔ اگر کوئی سیدھے رخسار پر طمانچہ مار دے تو دوسرا گال بھی اس کے روبرو پیش کردیا جائے۔ یہ ایک کھلی بات ہے کہ ایسے احکام پر عمل کرنا بہت شاق گزرتا ہے کسی خوددار، غیرت پسند انسان سے تو یہ ممکن نہیں، ہاں کوئی ذلت پسند اور دنی الطبع اس کو برداشت کرلے تو کرلے۔ اگر اس پر عمل کرلیا جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوجائیگا اور زبردست لوگ کمزور انسانوں کو اپنے ظلم وجور کا تختۂ مشق بنالیں گے اور اگر اس کو رد کردیا جائے گا تو مسیحیت کے معتقدین کے پاس کوئی ایسا اخلاقی ضابطہ باقی نہ رہے گا جو دنیوی حکمرانی میں ان کو راہ راست پر قائم رکھے نتیجہ یہ ہوگا کہ مسیح کی بھیڑیں منقلب ہوکر بھیڑیوں کی شکل اختیار کرلیں گی، چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ کشت وخون اور ظلم وستم وہی لوگ کر رہے ہیں جو مسیح

اور ان کی تعلیم پر ایمان لانے کے مدعی ہیں۔

اسی لیے دین فطرت نے اپنے احکام و قوانین اور اوامر و نواہی کے اصول و فروع کی بنیاد ہی ایسی حکمتوں اور مصلحتوں پر رکھی ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں، اور ایسی تکلیف کا انسانوں پر بوجھ نہیں ڈالا جو بشری طاقت کی برداشت سے باہر ہو۔ بلکہ قرآن عزیز نے ان مواقع پر جو ہدایات فرمائی ہیں وہ عدل و انصاف اور مساوات پر مبنی ہیں چنانچہ پروردگار عالم کا ارشاد ہوتا ہے۔

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ وَلَمَنِ انتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِم مِّن سَبِيلٍ - إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔ (شوریٰ۔ رکوع ۴)

اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو شخص معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے بے شک اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو شخص ظلم کیے جانے کے بعد برابر کا بدلہ لے لے تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں، الزام تو صرف ان لوگوں کی ہے جو اوروں پر ستم ڈھاتے ہیں اور ناحق زمین پر بغاوت پھیلاتے ہیں، انہیں لوگوں کے لیے دردناک عذاب مقرر ہے اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہوگا۔

غور کیجیے کہ قرآن کریم نے عدل و انصاف کا حکم دیا ہے اور عدل کے مراتب کی تشریح کی ہے اور پھر عقلی مصلحت کا کیسا لحاظ کیا گیا ہے۔ کیا ایسی بہترین اصلاح قرآن کے نازل ہونے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے بھی دنیا میں موجود تھی!

مسیح نے اپنے پیروؤں کو تعلیم دی تھی کہ "دنیا چھوڑ دو" "مال و دولت کو ٹھکرا دو" انہوں نے مالداروں کی یہاں تک مذمت فرمائی کہ "سوئی کے ناکہ میں اونٹ کا گھسنا تو ممکن ہو سکتا ہے مگر کسی مالدار کا

اللہ تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل ہونا ممکن نہیں؟۔

شاید ان دو باتوں کو دیکھ کر کوئی سطحی رائے رکھنے والا یہ سمجھ لے کہ یہ دائمی قانون تھا نہیں بلکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک وقتی اور عارضی اصلاح تھی کیونکہ یہودیوں میں سرمایہ پرستی بہت بڑھ چکی تھی اور وہ مال کی محبت میں اس درجہ غلو کر گئے تھے کہ اس کے باعث اخلاق اور عادات و دینی رسوم وعوائد تک میں انہوں نے پہلو تہی کرنی شروع کر دی تھی چونکہ یہودی ایک انتہا پر پہنچ چکے تھے اس لیے مسیح ان کی افراط کو توڑنے کے لیے انہیں دوسری انتہا کی طرف لے گئے۔ مگر اعتدال کا مقام انہوں نے نہیں بتایا۔ یہ کام شریعت محمدی کا تھا کہ اس نے دولت و ثروت کے مقابلہ میں ایک معتدل اور قابل عمل ضابطہ سے دنیا کو روشناس کیا۔ اس نے ایک طرف دولت کمانے کے طریقوں میں امتیاز پیدا کیا اور دوسری طرف دولت صرف کرنے کی صورتوں میں تمیز پیدا کی۔ اگر کوئی شخص حلال طریقے سے کمائے اور جائز راستوں میں صرف کرے تو اس کی دولت خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو، اس کے لیے لعنت نہیں بلکہ رحمت ہے۔ وہ اس کی وجہ سے آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے روکا نہ جائے گا بلکہ یہی دولت اس کو آسمانی بادشاہت میں لے جائے گی اور بڑے مرتبے دلوائے گی بخلاف اس کے اگر کوئی شخص حرام طریقہ سے کمائے اور حرام طریقوں میں صرف کرے یا جمع رکھے تو اس کی دولت یقیناً اس کے لیے ہلاکت کی موجب ہوگی۔ یہ ہے وہ اعتدال جو اسلام نے پیدا کیا اور یہی وہ قانون ہے جو دائمی اور عالمگیر بن سکتا ہے۔

خاتمۂ سخن: دین اسلامی کے تینوں ارکان ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر اور عمل صالح کے متعلق ہم نے کسی قدر تفصیلی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ اس کی اور بہت کچھ تفصیل کی جا سکتی ہے۔ اور یہی مشترک حقیقت تمام آسمانی مذاہب میں موجود ہے اور جتنی بھی صداقتیں ہم کو نظر آ رہی ہیں وہ سب اسلام ہی اسلام ہیں البتہ قوموں نے اپنی اصلی اور صحیح تعلیمات کو بھلا دیا تھا "وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ" تو خداوند قدوس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور قرآن عزیز

کو نازل کیا۔ تاکہ قوموں اور ملتوں کی گمراہیاں تبلائی جائیں، ان کی غلط کاریوں کی اصلاح کی جائے، "وحدت نوع انسانی" اپنی صحیح شکل و صورت میں نمودار ہو کر فطرت کے مطابق فاطر السموات والارض ہی کے آگے سرنیاز خم کرے، اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی حکومت نیست و نابود ہو جائے۔ انسان کے کمال فطری کی تکمیل ہو اور وہ "احسن تقویم" کا پورا پورا مظہر بن جائے۔ وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔